مروجہ اسلامی بینکاری

سے متعلق

مدلل فتویٰ

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں:

(۱) مروجہ اسلامی بینکاری جزیاتی مطالعہ، شرعی جائزہ، فقہی نقد و تبصرہ

(۲) نام نہاد اسلامی بینکاری اکابرین امت کے فتاویٰ و تحقیق کی روشنی میں

(۳) غیر سودی بینکاری ایک منصفانہ علمی جائزہ

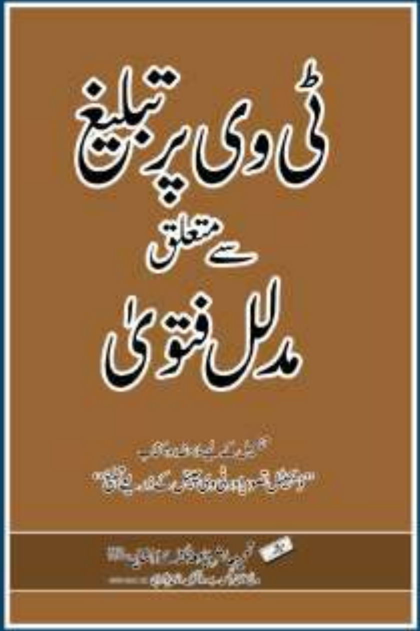

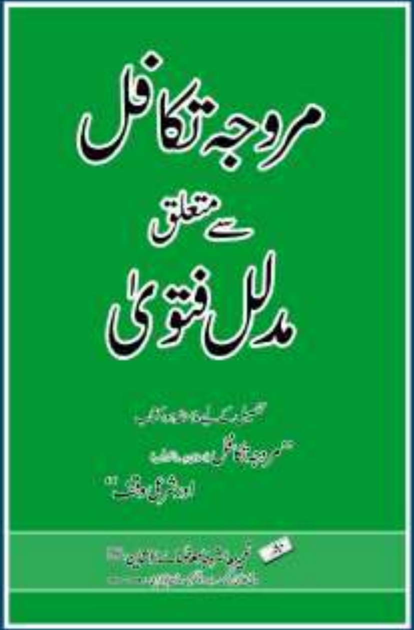

ناشر
تعمیر معاشرہ جامعہ خلفائے راشدین
مدنی کالونی، ہاکس بے روڈ، گریکس، ماڑی پور کراچی 0333-2117851

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کیا فرماتے ہیں علماءِ کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اسلامی نامی بینکوں میں اور وہ روایتی بینک، جنہوں نے اسلامی بینکنگ کا شعبہ کھولا ہے، میں رقم جمع کرانا اور نفع لینا، اسی طرح مرابحۃً کوئی چیز خریدنا یا بطورِ اجارہ (لیز) کوئی چیز کرائے پر لینا، جائز ہے یا نہیں؟ المستفتی : (مولانا) محمد مجاہد کراچی

الجواب باسم ملهم الصواب

چونکہ اس میں بہت سارے امور خلافِ شرع ہیں جن کے پیشِ نظر ان میں رقم جمع کرانا، ناجائز اور اس پر نفع کے نام سے کچھ لینا حرام ہے۔ اسی طرح ان کے مرابحات اور اجارات بھی کئی خلافِ شرع امور کی وجہ سے ناجائز اور بحکمِ سود ہیں۔ اس لیے بینک سے بطورِ مرابحہ کوئی چیز خریدنا یا اجارہ کے طور پر گاڑی وغیرہ کرائے پر لینا بھی ناجائز اور اس میں سود کا گناہ ہے۔

بعض خلاف شرع امور درج ذیل ہیں :

بینک میں شرکت : جوازِ شرکت دو باتوں پر موقوف ہے:

﴿۱﴾ عقد شرعی اصولوں کے مطابق ہو۔

﴿۲﴾ کاروبار بھی شرعی اصولوں کے مطابق صحیح ہو۔

﴿**پہلی بات**﴾ : عقد شرعی اصولوں کے مطابق ہو۔

پانچ وجوہ سے یہ عقد شرعی اصولوں کے مطابق نہیں اس لیے ان وجوہِ خمسہ کی بنا پر ان بینکوں میں شرکت کرنا ناجائز اور یہ عقد فاسد ہے۔

عقد شرکت بنوکیہ کے فساد کی وجوہ خمسہ :

(**وجہ نمبر ۱**) : احناف رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرکتِ اموال کے جواز کے لیے ایک شرط یہ بھی ہے کہ بوقتِ عقد سب شرکاء کا سرمایہ نقد ہو جبکہ بینک میں قدیم شرکاء (وہ اکاؤنٹ ہولڈرز جن کا سرمایہ پہلے سے بینک کے پاس کاروبار میں لگا ہوا ہے) کے سرمایہ کا بعض حصہ عروض (سامان اور اثاثوں) کی صورت میں ہوتا ہے جبکہ جدید شریک (نئے اکاؤنٹ ہولڈرز) کا سرمایہ نقد کی صورت میں ہوتا ہے، لہٰذا یہ شرکت بعض (جدید اکاؤنٹ ہولڈرز) کی طرف سے نقد اور بعض (یعنی قدیم اکاؤنٹ ہولڈرز) کی طرف سے عروض

(سامان اور اثاثے) ہونے کی وجہ سے جائز نہیں۔

قال ملک العلماء الكاسانی رحمه الله تعالیٰ : لاتصح الشركة فی العروض. (وفيه ايضا) : ان معنى الوكالة من لوازم الشركة والوكالة التی يتضمنها الشركة لا تصح فی العروض......الخ . (بدائع الصنائع ۲/۵۹، ط: رشيديه)

قال الامام السرخسی رحمه الله تعالیٰ : فأما الشركة بالعروض من الدواب والثياب والعبيد : لا تصح عندنا وعلى قول ابن أبي ليلى ومالک رحمهما الله هی صحيحة ؛ للتعامل وحاجة الناس إلى ذلک ولاعتبار شركة العقد بشركة الملک وفی الكتاب علل للفساد فقال : لأن رأس المال مجهول يريد به أن العروض ليست من ذوات الأمثال . وعند القسمة لا بد من تحصيل رأس مال كل واحد منهما ؛ ليظهر الربح . فإذا كان رأس مالهما من العروض فتحصيله عند القسمة يكون باعتبار القيمة وطريق معرفة القيمة الحرز والظن ولا يثبت التيقن به . ثم الشركة مختصة برأس مال يكون أول التصرف به بعد العقد شراء لا بيعا وفی العروض أول التصرف يكون بيعا وكل واحد منهما يصير موكلا لصاحبه ببيع متاعه على أن يكون له بعض ربحه وذلک لا يجوز . وقد بينا أن صحة الشركة باعتبار الوكالة . ففی كل موضع لا تجوز الوكالة بتلک الصفة فكذلک الشركة . ومعنى هذا أن الوكيل بالبيع يكون أمينا فإذا شرط له جزء من الربح كان هذا ربح ما لم يضمن والوكيل بالشراء يكون ضامنا للثمن فی ذمته فإذا شرط له نصف الربح كان ذلک ربح ما قد ضمن ولأن فی الشركة بالعروض ربما يظهر الربح فی ملک أحدهما من غير تصرف بتغير السعر فلو جاز استحق الآخر حصته من ذلک الربح من غير ضمان له فيه . وربما يخسر أحدهما بتراجع سعر عروضه ويربح الآخر ؛ فلهذه المعانی بطلت الشركة بالعروض.......... وكذلک لا يصح ان يكون رأس مال أحدهما دراهم ورأس مال الآخر عروضا فی مفاوضة ولا عنان ؛ لجهالة رأس المال فی نصيب صاحب العروض على ما بينا. (المبسوط للسرخسی ۱۱/۱۷۴، ط: رشيديه)

مالکیہ رحمهم الله تعالیٰ کا مذہب: مالکیہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک سرمایہ عروض کی شکل میں بھی فراہم کرنا جائز ہے خواہ عروض مثلی (جن کی مثل بازار میں دستیاب ہو) ہوں یا قیمی (جن کی مثل

بازار میں دستیاب نہ ہو)،عروض چاہے ایک جانب سے ہوں یا دونوں جانب سے۔ جیسے دو آدمی آپس میں شرکت کریں اور ایک آدمی کی طرف سے سرمایہ ایک لاکھ روپے ہو اور دوسرے آدمی کی جانب سے سرمایہ دکان کا سامان ہو، لیکن واضح رہے کہ امام مالک رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرکت بالعروض کی صحت کے لیے ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ بوقتِ عقد عروض کی بازاری قیمت لگا کر اس کو سرمایہ بنایا جائے تاکہ بعد میں نفع اور نقصان کی تقسیم میں دشواری نہ ہو۔ مثلاً ایک آدمی کا سرمایہ ایک لاکھ ہے اور دوسرے آدمی کی جانب سے سرمایہ دکان کا سامان ہے تو دوسرے آدمی کا سرمایہ کتنا ہے؟ اس کی طرف سے تو سامان ہے تو سامان پر اس کو کیسے نفع دیں گے؟ لہٰذا امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ شرط لگائی ہے کہ اس سامان کی بازاری قیمت لگاؤ پھر جب وہ قیمت لگائی گئی تو مثلاً وہ ۳ لاکھ تھی تو اس کا سرمایہ ۳ لاکھ ہوا، اب اگر نقصان ہوگا تو اس کو نقصان ۳ لاکھ کے تناسب سے ہوگا اور نفع بھی اسی تناسب سے معلوم ہو کر تقسیم ہوگا۔

امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا مذہب: امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کی ایک روایت تو احناف رحمہم اللہ تعالیٰ کی مانند ہے اور ایک روایت میں وہ فرماتے ہیں کہ شرکت بالعروض جائز ہے لیکن اسی شرط کے ساتھ جیسا کہ مالکیہ کے مذہب میں گزرا۔

قال العلامة ابن قدامة الحنبلي رحمه الله تعالىٰ: فأما العروض فلا تجوز الشركة فيها في ظاهر المذهب .نص عليه أحمد في رواية أبي طالب وحرب .وحكاه عنه ابن المنذر......وعن احمد رواية اخرى ان الشركة والمضاربة تجوز بالعروض وتجعل قيمتها وقت العقد راس المال ...... وهو قول مالك.(المغني ۷/۱۲۴،ط:هجر،قاهره)

شوافع رحمہم اللہ تعالیٰ کا مذہب: شوافع رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک اگر سرمایہ نقد کے بجائے عروضِ مثلیہ ہو (جس کی مثل بازار میں ملتی ہو) تو بھی شرکت جائز ہے البتہ اگر عروض قیمی ہوں (بازار میں ان کی مثل نہ ملتی ہو) تو شرکت ناجائز ہے۔ (شرکت ومضاربت عصرِ حاضر میں، ص:۲۴۸،۲۴۹)

مذہب مالکیہ کی جو تفصیل اوپر لکھی گئی ہے، حضرات مجوزین بھی اس کے قائل ہیں چنانچہ حضرت شیخ الاسلام کے صاحبزادے ڈاکٹر مولانا مفتی عمران اشرف عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

کیا سرمایہ کا نقد ہونا ضروری ہے؟

شرکت کے اندر سرمایہ کیسا ہونا چاہیے؟ کیا یہ ضروری ہے کہ جو لوگ شرکت قائم کریں ان میں سے ہر شخص اپنی سرمایہ کاری کا حصہ نقد فراہم کرے؟ یا کوئی شریک اپنا حصہ جنس کی صورت میں بھی دے سکتا ہے؟ اس کے بارے میں فقہاء کرام کی آراء مختلف ہیں۔

احناف کا مذہب: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جنس (سامان) کی شکل میں سرمایہ لگا کر شرکت العقد وجود میں لانا جائز نہیں، خواہ وہ سامان مثلی اشیاء میں سے ہو یا قیمتی اشیاء میں سے ہو۔

مالکیہ کا مذہب: اس کے برعکس مالکیہ کے نزدیک جنس کی شکل میں سرمایہ فراہم کر کے شرکت مطلقاً جائز ہے، خواہ وہ سامان مثلیات میں سے ہو خواہ قیمیات میں سے ہو، نیز یہ بھی جائز ہے کہ دونوں شریک اپنا سرمایہ جنس کی صورت میں فراہم کریں اور یہ بھی جائز ہے کہ ایک شریک نقد روپے لائے اور دوسرے کا سرمایہ جنس کی شکل میں ہو۔

مالکیہ کہتے ہیں جب کوئی شریک سامان کی صورت میں سرمایہ فراہم کرے تو اس کے حصے کا تعین اس سامان کی بازاری قیمت کی بنیاد پر کیا جائے گا۔ (شرکت ومضاربت عصر حاضر میں ص:۲۴۸)

نیز لکھتے ہیں: اگر کوئی شخص کسی چلتی ہوئی صنعت (Industry) میں اپنا روپیہ لگائے اور صنعتکار کے ساتھ شرکت کر لی تو یہ جائز ہے مثلاً زید کا ایک کپڑے کا کارخانہ ہو، اور بکر اس میں ایک لاکھ روپے ڈال کر اس کارخانے میں حصہ دار بن جائے اور اس طرح زید اور بکر اس کپڑے کی صنعت میں شرکت کر لیں اس صورت میں زید کا سرمایہ عروض (جنس) کی شکل میں ہوا اور بکر کا سرمایہ نقد شکل میں، لہٰذا زید کے کارخانے کی قیمت لگا کر اس کا سرمایہ متعین کیا جائے گا اور اس کی بنیاد پر شرکت قائم کی جاسکے گی کیونکہ یہ بات پیچھے آچکی ہے کہ سرمایہ شرکت کا نقد ہونا لازمی نہیں ہے۔ (شرکت ومضاربت عصر حاضر میں ص: ۲۵۵)

اکابر کا ارشاد: اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ نے بھی بوقتِ عقد عروض کی قیمت لگانے کی شرط کی تصریح فرمائی ہے، چنانچہ حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ کمپنی کے حصص کی خریداری اور اس میں شرکت سے متعلق ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

الجواب و الله الموفق للحق و الصواب

ا۔ بظاہر اس عقد کی حقیقت شرکتِ عنان ہے، کیونکہ جو لوگ کمپنی قائم کرتے ہیں، وہ دوسروں کو شریک کرنے کے وقت خود کو بھی کمپنی کا ایک حصہ دار قرار دیتے ہیں اور اپنی عماراتِ مملوکہ متعلقہ کمپنی اور جملہ سامان و مال تجارت کو نقد کی طرف محمول کر لیتے ہیں مثلاً ان لوگوں نے دس ہزار روپیہ کمپنی قائم کرنے کے عمارات و سامان وغیرہ میں لگایا تو وہ اپنے کو کمپنی کے سو/۱۰۰ حصوں کا حصہ دار ظاہر کریں گے، البتہ اس صورت میں کمپنی قائم کرنے والوں کی طرف سے شرکت بالنقد نہ ہوگی بلکہ بالعروض ہوگی، سو بعض ائمہ کے نزدیک یہ صورت جائز ہے۔

فیجوز الشرکة و المضاربة بالعروض بجعل قیمتها وقت العقد رأس المال عند أحمد فی روایة و هو قول مالک و ابن أبی لیلی کما ذکره الموفق فی المغنی ۵/۱۲۵

پس ابتلائے عام کی وجہ سے اس مسئلہ میں دیگر ائمہ کے قول پر فتوی دے کر شرکت مذکورہ کے جواز کا فتوی دیا جاتا ہے۔ (امداد الفتاوی ۳/۴۹۴)

الحاصل! سرمایہ کے نقد یا عروض ہونے کے اعتبار سے سب سے زیادہ وسعت حضرات مالکیہ رحمہم اللہ تعالی کے مذہب میں ہے، پھر بھی شرکتِ بنوکیہ ان کے نزدیک جائز نہیں کیونکہ ان کے نزدیک شرکت بالعروض کی صحت کے لیے یہ شرط ہے کہ بوقتِ عقد عروض کی بازاری قیمت لگا کر اس کو سرمایہ بنایا جائے جبکہ شرکت بنوکیہ میں عروض کی قیمت نہیں لگائی جاتی۔

وجہ نمبر ۱ میں حرمت کا عنصر: لہٰذا جب قیمت نہیں لگائی جاتی تو قدیم شرکاء کا حقیقی سرمایہ معلوم نہ ہوگا لہٰذا قیمت لگانے کی صورت میں اگر حقیقی سرمایہ بڑھتا ہے تو اس صورت میں یہ بڑھوتری اور اس کے تناسب سے نفع ان کا حق بنتا ہے جبکہ بینک ان کا یہ حق دوسروں کو ناحق کھلاتے ہیں، اور اگر حقیقی سرمایہ کم ہو گیا تو دوسرے نئے آنے والوں کا حق ان کو کھلایا جا رہا ہے اور یہ اکل بالباطل میں داخل اور ناجائز ہے۔

بعض شبہات کے جوابات :

شبہہ نمبر ۱: یہ کہنا کہ عروض کی قیمت نہیں لگائی جاتی، کمپیوٹرائزڈ نظام سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ کمپیوٹر

کا یہ کمال ہے کہ وہ منٹوں اور سیکنڈوں میں تمام حسابات کر کے سب کچھ بتا دیتا ہے؟

جواب ۱: کمپیوٹر میں وہ کون سا پرزہ ہے جس کے دبانے سے بینک کی وہ تمام مملوکہ اجارہ اور کرایہ پر دی گئیں ہزاروں گاڑیوں اور عملہ کی گاڑیوں اور فرنیچرز اور وہ زمینی اثاثے وغیرہ جو بینک کی ملکیت ہیں جو یقیناً مختلف کنڈیشنز میں ہوتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کو مارکیٹ لے جانے اور اس شعبے کے ماہر تاجروں کو دکھائے بغیر محض اس پرزے کے دبانے سے سب کی موجودہ بازاری قیمت سامنے آجاتی ہے، برائے مہربانی اس پرزے کا نام بتائیے؟

جواب ۲: ہر عمل کے ساتھ اس کے نتیجہ اور اثر کا لازم ہونا ایک مسلّم حقیقت ہے۔ عروض کی قیمت لگانے کا عمل اگر واقعۃً عملی طور پر بینکوں میں ہوتا ہے تو اس کا نتیجہ اور اثر ضرور سامنے آنا چاہیے جبکہ آج تک کسی نے اس کے اثر اور نتیجے کو نہیں دیکھا۔

اس عمل کے نتیجہ اور اثر میں تین احتمال ہیں:

(۱) عروض کی بازاری قیمت بوقتِ عقد جمع کیے ہوئے سرمائے کے مطابق ہو۔

(۲) سرمایہ سے زیادہ ہو۔

(۳) سرمایہ سے کم ہو۔

پہلا احتمال عادۃً محال ہے۔ اگرچہ فی نفسہ ممکن ہے کیونکہ اگر تجارت ترقی پر ہے تو احتمال نمبر۲ کا نتیجہ ظاہر ہوگا اور عروض کی قیمت سرمائے سے زیادہ ہوگی، اور اگر زوال پذیر ہے تو احتمال نمبر۳ کا نتیجہ ظاہر ہوگا اور قیمت سرمائے سے کم ہوگی۔

کیا اکثری احتمال پر مبنی نتیجے کے اثر کو آج تک کسی ایک فرد نے بھی دیکھا ہے؟ کیا کبھی بینک نے کسی قدیم شریک کو کہا ہے کہ جدید اکاؤنٹ ہولڈرز کے آنے کے وقت ہم نے آپ کے حصے کے عروض کی قیمت لگائی تو آپ کا سرمایہ بڑھ گیا اور اب آپ کا آئندہ سرمایہ یہی سمجھا جائے گا اور اسی زائد سرمائے کے تناسب سے نفع دیا جائے گا؟؟؟

شبہہ نمبر ۲: ہر ماہ شریک اور کلائنٹ کو جو نفع کے نام سے دیا جاتا ہے وہ تحقیقی نفع ہے یعنی سرمایہ سے جتنا بڑھ رہا ہے وہ سارا کا سارا ہر مہینے دے دیا جاتا ہے اس لیے اس کا سرمایہ ہمیشہ کے لیے اپنے حال پر

رہتا ہے؟

جواب ۱ : یہ جواب بظاہر حقیقتِ حال سے ناواقیت پرمبنی اور دفع الوقتی کے لیے گھڑا گیا ہے، کیونکہ حضرات مجوزین خود بھی ہر ماہ تحقیقی نفع دینے کو ناممکن ہی سمجھتے ہیں کہ اتنے بکھرے ہوئے کاروبار کا ہر ماہ تحقیقی حساب متعذر نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ اس لیے وہ یہ فرماتے ہیں کہ یہ نفع علی الحساب ہے۔ (اگرچہ یہ حساب آج تک دنیا میں تو کسی نے دیکھا نہیں، شاید آخرت میں ہو)

جواب ۲ : اگر بالفرض والتقدیر اس تحقیقی حساب اور نفع کے مفروضے کو مان بھی لیا جائے تو بھی ہمارا اصل اشکال برقرار ہے کیونکہ مثلاً چودہ پندرہ تاریخ کو جو لوگ رقم جمع کرتے ہیں اس وقت قدیم شرکاء کے حصوں کا گزشتہ چودہ پندرہ دنوں کا جو نفع ہوتا ہے، ان کے حصوں کے ساتھ ہوتا ہے تو اس وقت قیمت لگا کر ان کے حصے اور سرمائے کو بڑھانا شرعاً لازم ہے۔ جبکہ بینک میں اس کا اہتمام نہیں ہوتا۔ ورنہ ثبوت پیش کرے۔

(وجہ نمبر ۲) : احناف وغیرہ تمام مذاہب میں (معمولی فرق کے ساتھ) جوازِ شرکت کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ سب شرکاء کا سرمایہ حاضر اور موجود ہو کسی کا سرمایہ دین اور غائب نہ ہو ورنہ شرکت جائز نہ ہوگی، جبکہ شرکتِ بنوکیہ میں قدیم شرکاء کے سرمائے کا بعض حصہ دیون کی صورت میں ہوتا ہے کیونکہ بینک کی تمام بیوع مرابحاتِ مؤجلہ ہوتی ہیں۔

قال ملک العلماء الكاساني رحمه الله تعالىٰ: ومنها : أن يكون رأس مال الشركة عينا حاضرا لا دينا ولا مالا غائبا فإن كان لا تجوز عنانا كانت أو مفاوضة لأن المقصود من الشركة الربح وذلک بواسطة التصرف ولا يمكن في الدين ولا المال الغائب فلا يحصل المقصود وإنما يشترط الحضور عند الشراء لا عند العقد لأن عقد الشركة يتم بالشراء فيعتبر الحضور عنده حتى لو دفع إلى رجل ألف درهم فقال له : أخرج مثلها واشتر بهما وبع فما ربحت يكون بيننا فأقام المأمور البينة أنه فعل ذلک جاز وإن لم يكن المال حاضرا من الجانبين عند العقد لما كان حاضرا عند الشراء.
(بدائع الصنائع، ۵/ ۷۹، ط: رشيديه جديد)

مالکیہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا مذہب : سرمایہ کا عقد کے وقت موجود ہونا ضروری ہے لہٰذا اگر دونوں طرف سے مال موجود نہ ہو یعنی ایک طرف سے مال آجائے اور دوسری جانب سے نہ آیا ہو تو شرکت کی صحت کے لیے دو شرائط ضروری ہوں گی:

(۱) دونوں شریک اس وقت تک کام نہ کریں جب تک کہ غائب مال آجائے۔

(۲) غائب مال بہت دور نہ ہو پھر بعض مالکیہ کے ہاں مطلب یہ ہے کہ دو دن کے اندر اندر آسکے اور بعض نے کہا کہ زیادہ سے زیادہ اس کی آمد میں دس روز لگ سکیں۔

حنابلہ اور شوافع رحمہم اللہ تعالیٰ کا مذہب : فقہائے حنابلہ وشوافع رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرکت میں مال کا موجود ومتعین ہونا بوقتِ عقد ضروری ہے چنانچہ اگر مال موجود نہ ہو یا کسی کے ذمہ دین ہو تو بغیر کسی قید اور شرط کے شرکت ناجائز ہوگی، اس لیے کہ ان کے ہاں شرکت میں مال کا مخلوط کرنا شرط ہے اور جب مال ہی نہ ہو تو سرمایہ مخلوط کیسے ہو سکے گا؟ (شرکت ومضاربت عصرِ حاضر میں، ص: ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱)

الحاصل ! وجہ نمبر ۲ کے اعتبار سے سب سے آسان اور اسہل مذہب احناف رحمہم اللہ تعالیٰ کا ہے جبکہ شرکتِ بنوکیہ اس اسہل مذہب کے اعتبار سے بھی ناجائز ہے کیونکہ بینک میں قدیم شرکاء کا سرمایہ چار حصوں پر مشتمل ہوتا ہے:

(۱) نقد روپیہ

(۲) منجمد اثاثے

(۳) تجارتی سامان (جو خریدا جا چکا ہو لیکن ابھی تک آگے نہ بیچا گیا ہو)

(۴) دیون (یعنی مرابحات کی صورت میں ادھار بیچے گئے عروض وسامان کا وہ قرض جو خریدار کے ذمہ قسط وار واجب الادا ہے)

ان میں ایک جزء اور حصہ دیون کا بھی ہے جس کی وجہ سے قدیم شرکاء کے ساتھ شرکت ائمہ اربعہ رحمہم اللہ تعالیٰ میں سے کسی کے مذہب کے مطابق جائز نہ ہوگی۔

(وجہ نمبر ۳) : بینک سرمایہ سے زیادہ کاروبار کرتا ہے جس کو ''استدانہ'' کہتے ہیں اور یہ دو وجہ سے جائز نہیں۔

۱۔ اس کے لیے رب المال سے صریح اجازت لینا ضروری ہے جبکہ بینک اجازت نہیں لیتا ورنہ ثبوت پیش کرے۔

۲۔ اجازت کے بعد چونکہ اس میں شرکت وجوہ ہے، اس لیے استدانہ کے اموال وحسابات کا علیحدہ

رکھنا ضروری ہے جبکہ بینک کو نہ یہ مسئلہ معلوم ہے اور نہ ہی اس پر عمل کرتے ہیں ورنہ ثبوت فراہم کرے۔

قال الامام السرخسی رحمہ اللہ تعالیٰ : وَمَا استَدَانَ سَوَاءٌ كَانَ بِقَدرِ مَالِ المُضَارَبَةِ أَو أَقَلَّ أَو أَكثَرَ فَهُوَ بَينَهُمَا نِصفَانِ فَرِبحُهُ وَوَضِيعَتُهُ بَينَهُمَا نِصفَانِ حَتّٰى لَو هَلَكَتِ المُشتَرَاةُ بِالدَّينِ كَانَ ضَمَانُ ثَمَنِهَا عَلَيهِمَا نِصفَينِ .

وَلَو كَانَ أَمَرَهُ أَن يَستَدِينَ عَلٰى نَفسِهِ كَانَ مَا اشتَرَاهُ المُضَارِبُ بِالدَّينِ لَهُ خَاصَّةً دُونَ رَبِّ المَالِ ؛ لِأَنَّهُ فِي الِاستِدَانَةِ عَلٰى نَفسِهِ يَستَغنِي عَن أَمرِ رَبِّ المَالِ فَكَانَ وُجُودُ أَمرِهِ فِيهِ وَعَدَمُهُ سَوَاءً .... وَلَا تَكُونُ هٰذِهِ الشَّرِكَةُ بِطَرِيقِ المُضَارَبَةِ ؛ لِأَنَّ المُضَارَبَةَ لَا تَصِحُّ إِلَّا بِرَأسِ مَالٍ عَينٍ فَكَانَت هٰذِهِ الشَّرِكَةُ فِي مَعنٰى شَرِكَةِ الوُجُوهِ فَيَكُونُ المُشتَرٰى مُشتَرَكًا بَينَهُمَا نِصفَينِ فَلَا يَصِحُّ مِنهُمَا شَرطُ التَّفَاوُتِ فِي الرِّبحِ مَعَ مُسَاوَاتِهِمَا فِي المِلكِ فِي المُشتَرٰى .

(المبسوط للسرخسی، باب المضارب بامرہ رب المال ۲۲/۱۶۳،ط:رشیدیہ)

استدانہ اور نسیئہ میں فرق : ''نسیئہ'' کہتے ہیں سرمائے کے اندر اندر ادھار خریداری کرنا جیسے ایک ارب روپے سرمایہ ہے اور ایک ارب روپے کی خریداری کی گئی، لیکن ادائیگی پچاس لاکھ کی کی گئی اور پچاس لاکھ کا ادھار لیا گیا تو یہ ''نسیئہ'' کہلائے گا اور کاروبار میں اس کی اجازت ہوتی ہے۔

استدانہ یہ ہے کہ سرمائے سے زیادہ ادھار خریداری کی جائے جیسے ایک ارب روپے کے سرمائے کی بنیاد پر تین ارب کا کاروبار کرلیا جائے تو یہ سرمایہ سے زائد کاروبار ''استدانہ'' ہے جس کا حکم اوپر بیان ہوا۔ لہٰذا بینک کا زائد کاروبار کرنا ''استدانہ'' ہے نہ کہ ''نسیئہ'' (جیسے کہ بعض حضرات کو تسامح ہوا ہے اور انہوں نے ''نسیئہ'' کے جواز کی عبارت سے رب المال کی اجازت کے بغیر صرف عرفِ تجار کی وجہ سے استدانہ کا جواز تحریر فرمایا ہے)

(وجہ نمبر ٤) : بینک کرنٹ اکاؤنٹ سے بھی مشترک کاروبار کرتا ہے جبکہ یہ قرض ہے اور رب المال قرض کی صراحۃً اجازت بھی دے تو بھی قرض کا ضمان مضارب ہی پر ہوتا ہے، لہٰذا اس کا نفع ونقصان دونوں کا تعلق مضارب اور بینک سے ہوگا نہ کہ رب المال سے اور اس قرض سے خریدا ہوا سارا مال اور اس کا حساب علیحدہ رکھنا ضروری ہے، جبکہ بینک اس طرح نہیں کرتا ورنہ ثبوت پیش کرے۔

قال الامام السرخسی رحمہ اللہ تعالیٰ : وَالأَصَحُّ أَن يَقُولَ : الأَمرُ بِالِاستِقرَاضِ بَاطِلٌ . أَلَا تَرٰى أَنَّهُ لَو أَمَرَ رَجُلًا أَن يَستَقرِضَ لَهُ أَلفًا مِن فُلَانٍ فَاستَقرَضَهَا كَمَا أَمَرَهُ كَانَ الأَلفُ لِلمُستَقرِضِ دُونَ الآمِرِ .... وما كان الأمر بالاستقراض الا نظير الامر بالتكدی وهو باطل وما يحصل للمتكدی يكون له دون الآمر. (المبسوط للسرخسی،باب المضارب يأمره رب المال ۲۲/۱۶۴، ۱۶۵،ط:رشيديه)

(وجہ نمبر ٥) : شرکتِ عنان (اموال) میں ایسی شرط لگانا جو شرکت فی الربح کے لیے قاطع ہو، ناجائز اور مفسدِ عقد ہے جبکہ شرکت بنوکیہ میں یہ شرط بھی ہوتی ہے، کیونکہ بینک کے اکثر ملازمین جن کو تقسیمِ ربح سے قبل تنخواہیں دی جاتی ہیں، وہ ہیں جو شریک بھی ہیں۔

قال الامام ابن الهمام رحمہ اللہ تعالیٰ: قَولُهُ (وَلَا تَجُوزُ الشَّرِكَةُ إِذَا شُرِطَ لِأَحَدِ دَرَاهِمُ مُسَمَّاةٌ مِنَ الرِّبحِ) قَالَ ابنُ المُنذِرِ : لَا خِلَافَ فِي هٰذَا لِأَحَدٍ مِن أَهلِ العِلمِ. (فتح القدير ۶/ ۱۷۰،ط:رشيديه)

علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

شریک کا اجیر ہونا درست نہیں، بلکہ صورتِ جواز یہ ہے کہ جو شریک منیجر ہو اس کا حصہ منافع میں زیادہ کردیا جائے، مثلاً جو شریک منیجر نہیں ان کا حصہ روپیہ میں دو آنہ ہے تو منیجر کا حصہ روپیہ میں چار آنہ کردیا جائے۔ لیکن یہ جائز نہیں کہ اس کے تنخواہ مقرر کی جائے۔ (امداد الاحکام:۳/۳۲۴)

﴿دوسری بات﴾ : کاروبار بھی شرعی اصولوں کے مطابق صحیح ہو۔

کاروبار شریعت کے مطابق ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں چار باتوں کا اطمینان ضروری ہے:

۱۔ کاروبار سرمایہ کے مطابق ہو۔

۲۔ کاروبار جائز ہو۔

۳۔ روزمرہ کے معاملات شرعاً درست ہوں۔

۴۔ نفع ونقصان کی تقسیم کا طریقہ کار شریعت کے مطابق ہو۔

مروجہ اسلامی نامی بینکوں میں ان چاروں باتوں میں سے تین باتوں کا اطمینان نہیں جسکی تفصیل یہ ہے:

(۱) کاروبار سرمایہ کے مطابق ہے یا نہیں؟ اس کے اطمینان کے لیے ضروری ہے کہ کل سرمایہ معلوم ہو جبکہ بینک میں کل سرمایہ کسی کو بھی معلوم نہیں ہوتا، بلکہ معلوم ہونا ممکن ہی نہیں اور کوئی یہ

١

نہیں بتا سکتا کہ اس ماہ یا سال کتنے سرمایہ سے کاروبار ہوا کیونکہ ان بینکوں میں ہر دن بلکہ ہر گھنٹہ و منٹ میں سرمایہ بدلتا رہتا ہے حالانکہ نفع و نقصان کی صحیح تقسیم کے لیے بوقتِ تقسیم شرعاً یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ ابتدائے عقد سے ہمارے پاس اتنا سرمایہ تھا جس سے اب تک کاروبار ہوا گویا کہ پوری مدتِ تجارت میں سرمایہ کا ایک ہونا اور بوقتِ تقسیم معلوم ہونا ضروری ہے۔

قال الامام السرخسی رحمہ اللہ تعالیٰ: وَكَذٰلِكَ لَا يَصِحُّ أَنْ يَكُونَ رَأْسُ مَالِ أَحَدِهِمَا دَرَاهِمَ وَرَأْسُ مَالِ الآخَرِ عُرُوضًا فِي مُفَاوَضَةٍ وَلَا عَنَانٍ ؛ لِجَهَالَةِ رَأْسِ المَالِ فِي نَصِيبِ صَاحِبِ العُرُوضِ عَلَى مَا بَيَّنَّا .

(المبسوط للسرخسی ١١/١٧٤، ط: رشیدیہ)

البتہ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کا علم بوقتِ عقد شرط ہے اور احناف کے نزدیک وقتِ شراء تک بھی اگر معلوم ہو جائے تو بھی درست ہے۔

وقال ملک العلماء الکاسانی رحمہ اللہ تعالیٰ: وَأَمَّا العِلْمُ بِمِقْدَارِ رَأْسِ المَالِ وَقْتَ العَقْدِ فَلَيْسَ بِشَرْطٍ لِجَوَازِ الشَّرِكَةِ بِالأَمْوَالِ عِنْدَنَا وَعِنْدَ الشَّافِعِيِّ رَحِمَهُ اللّٰهُ شَرْطٌ وَجْهُ قَوْلِهِ أَنَّ جَهَالَةَ قَدْرِ رَأْسِ المَالِ تُؤَدِّي إِلَى جَهَالَةِ الرِّبْحِ وَالعِلْمُ بِمِقْدَارِ الرِّبْحِ شَرْطُ جَوَازِ هٰذَا العَقْدِ فَكَانَ العِلْمُ بِمِقْدَارِ رَأْسِ المَالِ شَرْطًا وَلَنَا أَنَّ الجَهَالَةَ لَا تَمْنَعُ جَوَازَ العَقْدِ لِعَيْنِهَا بَلْ لِإِفْضَائِهَا إِلَى المُنَازَعَةِ وَجَهَالَةُ رَأْسِ المَالِ وَقْتَ العَقْدِ لَا تُفْضِي إِلَى المُنَازَعَةِ ؛ لِأَنَّهُ يُعْلَمُ مِقْدَارُهُ ظَاهِرًا وَغَالِبًا لِأَنَّ الدَّرَاهِمَ وَالدَّنَانِيرَ تُوزَنَانِ وَقْتَ الشِّرَاءِ فَيُعْلَمُ مِقْدَارُهَا فَلَا يُؤَدِّي إِلَى جَهَالَةِ مِقْدَارِ الرِّبْحِ وَقْتَ القِسْمَةِ .

(بدائع الصنائع ٥/٨٣، ط: رشیدیہ جدید)

(٢) روز مرہ کے معاملات بھی خلاف شرع ہیں: کیونکہ ان بینکوں میں جو اجارات و بیوعات مرابحہ ہوتے ہیں وہ درج ذیل وجوہ سے فاسد اور ناجائز ہیں اور معاملاتِ فاسدہ بحکم سود اور ان سے حاصل ہونے والا نفع حرام اور واجب التصدق ہے جبکہ بینک بجائے تصدق کے ان حرام منافع کو ارباب الاموال (اکاؤنٹ ہولڈرز) میں تقسیم کر کے سب کو حرام کھلاتا ہے۔

وجوہ مُفسدہ:

(الف) مقتضائے عقد کے خلاف شرائط لگائی جاتی ہیں جیسے محدود ذمہ داری کی شرط پر خریداری کرنا، عقد

٢

سے قبل وعدۂ اجارہ و بیع کر کے اس کو پورا کرنے پر مجبور کرنا اور انکار کی صورت میں جرمانہ کرنا، تاخیر قسط کی صورت میں التزام تصدق کی شرط لگانا۔

(ب) سیکورٹی ڈپازٹ جو کہ قرض ہے، سے استیجار اور شراء کا نفع حاصل کرنا جو "کل قرض جر منفعة فهو ربا" (الحدیث) میں داخل اور صریح سود ہے۔

(ج) اجارہ میں شےءِ موجر کی مرمت کے اخراجات مستاجر کے ذمہ لگانا۔

(٣) نفع و نقصان کی تقسیم کا طریق کار بھی خلاف شرع ہے: تفصیل اس کی یہ ہے کہ تقسیمِ منافع کے دو طریقے لکھے گئے ہیں:

ایک "غیر سودی بینکاری" (از دار العلوم کراچی) میں اور دوسرا "غیر سودی بینکاری" (از رفقاء دار الافتاء جامعۃ الرشید) میں اور دونوں طریقے حدیث "الخراج بالضمان" اور حدیث "الغنم بالغرم" اور حدیث "لایحل ربح مالم یضمن" اور درج ذیل عباراتِ فقہیہ کے خلاف ہیں۔

قال الامام السرخسی رحمہ اللہ تعالیٰ: ....لِأَنَّهُ لَوْ صَحَّ ذٰلِكَ اسْتَحَقَّ أَحَدُهُمَا جُزْءًا مِنْ رِبْحِ مَا ضَمِنَهُ صَاحِبُهُ وَذٰلِكَ لَا يَجُوزُ ....لِأَنَّ أَحَدَهُمَا يَشْتَرِطُ لِنَفْسِهِ رِبْحَ مَا قَدْ ضَمِنَ صَاحِبُهُ وَذٰلِكَ بَاطِلٌ .(المبسوط للسرخسی ٢٢/١٦٣)

١۔ منافع کی تقسیم کا طریقہ اول: زید اور عمرو نے بیس بیس لاکھ مثلاً جمع کر کے چھ ماہ تک کاروبار کیا، چھ ماہ کے بعد بکر سے بھی بیس لاکھ لے کر اس کو بھی ایک تہائی کاروبار میں شریک کر لیا اور یہ طے کر لیا کہ سال کے آخر میں بکر کو کل سالانہ منافع کا ١/٦ حصہ دیا جائے گا۔ چونکہ یہ طریقہ "ربح مالم یضمن" کو متضمن ہے اس لیے ناجائز ہے۔ دیکھیے! اگر شروع چھ ماہ میں چالیس لاکھ پر بارہ لاکھ نفع ہوا اور آخری چھ ماہ میں بکر کے سرمائے کے آنے کے بعد ساٹھ لاکھ پر مثلاً چھ لاکھ نفع ہوا تو اب اس صورت میں بکر چونکہ آخری چھ ماہ میں شریک ہوا ہے تو اس کو صرف آخری چھ ماہ کے نفع میں سے ١/٣ یعنی دو لاکھ ملنا چاہیے اور ابتداء کے چھ ماہ میں چونکہ نہ یہ شریک تھا اور نہ اس پر ضمان تھا لہٰذا اس کا نفع صرف زید اور عمرو کو ملنا چاہیے نہ کہ بکر کو جبکہ تجویز شدہ طریقے میں بکر کو بھی ملتا ہے کیونکہ ابتداء کے بارہ لاکھ + آخری چھ لاکھ، یہ کل اٹھارہ لاکھ ہوئے جن کا ١/٦ تین لاکھ ہوئے، یہ بکر کا حصہ ہوا اس حصے میں بکر کو گزشتہ ان چھ ماہ کا بھی ایک لاکھ نفع دیا گیا جن میں بکر پر ضمان نہیں

تھا لہٰذا یہ نفع ورنج مندرجہ بالا احادیث اور عبارات فقہیہ کے خلاف اور ناجائز اور حرام ہے۔ نیز آخری چھ ماہ میں گزشتہ چھ ماہ کے نفع جس کی مقدار بارہ لاکھ ہے، سے بھی کاروبار ہوا ہے لہٰذا اس کا نفع بھی صرف زید اور عمر و کو ملنا چاہیے جبکہ تجویز شدہ طریقہ کار میں اس نفع میں بکر کو بھی شریک کیا گیا ہے، حالانکہ اس شرکت کے جواز کی کوئی شرعی وجہ نہیں ورنہ بتادی جائے۔

۲۔ تقسیم منافع کا طریقہ دوم: جو کہ ''رفقاء دارالافتاء جامعۃ الرشید'' نے بیان کیا ہے۔ اس میں جن دنوں میں سرمایہ حقیقۃً کم ہے اور اوسطاً زیادہ ہے ان میں اس رب المال (اکاؤنٹ ہولڈر) کو "**ربح مالم یضمن**" (یعنی بدوں ضمان نفع) حاصل ہوا جو کہ حرام ہے اور دوسروں پر ظلم ہے اور جن دنوں میں سرمایہ زیادہ اور اوسط کم ہے تو ان میں دوسروں کو "**ربح مالم یضمن**" حاصل ہوا اور اس پر ظلم ہوا......نقصان کی صورت میں اس کا عکس ہے (یعنی اگر کاروبار میں بجائے نفع کے نقصان ہوا تو جن دنوں میں اوسط زیادہ ہے اور سرمایہ کم ہے ان دنوں میں اس کو نقصان کم ہونا چاہیے تھا جبکہ اس کو سرمائے سے زیادہ نقصان دیا جا رہا ہے اور یہ اس پر ظلم ہے اور جن دنوں میں سرمایہ زیادہ اور اوسط کم ہے ان دنوں میں اس کا نقصان زیادہ ہونا چاہیے جبکہ اس پر کم نقصان ڈالا جا رہا ہے جو دوسروں پر ظلم ہے)

تنبیہ: مذکورہ بالا طریقہ اول کتاب ''غیر سودی بینکاری'' از مفتی تقی عثمانی صاحب زید مجدہم، ص:۱۱۷ میں ایک سادہ سی مثال الخ اور دوسرا طریقہ کتاب ''غیر سودی بینکاری'' از رفقاء دارالافتاء جامعۃ الرشید، ص:۱۳۰ تا ۱۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں۔

شرکت ومضاربت شروع ہونے کے بعد بعض شرکاء کا کل یا بعض رقم نکلوانے کا طریقہ کار

مجوزین حضرات فرماتے ہیں کہ یہ بیع ہے اور بینک مارکیٹ ویلیو کے مطابق قیمت لگا کر دوسرے شرکاء کے لیے خریدتا ہے اور اس کو اصل سرمایہ مع طے شدہ شرح نفع کل رقم دی جاتی ہے۔

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب زید مجدہم فرماتے ہیں:

جو شخص اپنی رقم اس مشترک حوض سے نکلوانا چاہتا ہے وہ درحقیقت اپنا حصہ جزوی یا کلی طور پر دوسرے شرکاء کو فروخت کر دیتا ہے اور اس کی قیمت لگاتے وقت کاروبار کی اس وقت کی حیثیت مدِ نظر رکھی جاتی ہے...............(آگے لکھتے ہیں)......اب بات

اس قیمت کی رہ جاتی ہے جس پر شرکاء وہ حصہ خریدیں، اس کا منصفانہ فارمولا یہی ہو سکتا ہے کہ اگر اس وقت اثاثوں کو بازار میں فروخت کیا جاتا اور اس وقت نکلنے والے شریک کا راس المال میں اور اگر اس وقت تک نفع ہوا ہو تو نفع میں جتنا حصہ بنتا اس کے حصے کی اتنی ہی قیمت لگائی جائے گی اور نفع کا حصہ اس تناسب سے مقرر کیا جائے گا، جو شرکت کے وقت طے ہوا تھا۔ (غیر سودی بینکاری، ص:۳۲۷)

جامعۃ الرشید سے شائع شدہ کتاب میں لکھا ہے:

''......جبکہ شریک سے بینک جب حصہ خریدتا ہے تو:

(۱) مارکیٹ ویلیو (جو کہ عملاً BookValue ہوتا ہے) پر خریدتا ہے۔

(۲) بینک اس وقت تک کا نفع بھی رب المال کو اس کی قیمت میں شامل کر کے دیتا ہے۔

(غیر سودی بینکاری از جامعۃ الرشید ص:۱۲۷)

تنبیہ: ان حضرات کی یہ خبر خلافِ واقع ہے، کیونکہ بینک سے کلی یا جزوی طور پر رقم نکلوانے والے کی دو قسمیں ہیں:

(۱) مدت مکمل ہونے کے بعد نکالنے والے۔

(۲) تکمیلِ مدت سے پہلے نکالنے والے۔

دوسری قسم کے لوگ جب مدت سے پہلے رقم نکالتے ہیں تو قلیل مدت کے ''ویٹ'' کے تناسب سے بینک اصل رقم (سرمایہ) سے کٹوتی کر کے بقیہ واپس کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ ہی بازاری قیمت لگاتے ہیں اور نہ ہی سرمایہ مع نفع واپس کرتے ہیں بلکہ بعض صورتوں میں تو لیا ہوا نفع بھی واپس لے لیتے ہیں، اس کی مزید تفصیل ''ویٹ'' کی وضاحت پر موقوف ہے۔

ویٹ کی وضاحت: جو شخص زیادہ مدت کے لیے بینک میں رقم لگواتا ہے بینک اس کے پیسے کا ویٹ اور قیمت زیادہ مقرر کرتا ہے دوسرے لفظوں میں اس کو نفع زیادہ ملتا ہے اور جو کم مدت کے لیے لگاتا ہے اس کے پیسے کا ویٹ اور قیمت کم ہوتی ہے بالفاظِ دیگر اسے نفع کم ملتا ہے۔ مثلاً زید اور بکر دونوں نے بینک میں دس دس لاکھ روپے جمع کروائے لیکن زید نے پانچ سال کے لیے اور بکر نے دس سال کے لیے، اب بینک زید کو مدت کی کمی کی وجہ سے اس کے لیے جو شرح نفع مقرر کرتا ہے اس کے حساب سے ماہانہ فی لاکھ مثلاً ۱۰۰۰

۵

(ایک ہزار) روپے نفع بنتا ہے لیکن بکر نے چونکہ زیادہ مدت کے لیے رقم جمع کروائی ہے اس لیے بینک بکر کے روپے کی شرح نفع زیادہ مقرر کرتا ہے جس کے تناسب سے ماہانہ فی لاکھ مثلاً ۱۵۰۰ (پندرہ سو) روپے نفع بن جاتا ہے۔

شرح نفع کے اس اختلاف کا حاصل یہ ہوا کہ زید کے مقابلے میں بکر کو ہر ماہ ۵،۰۰۰ (پانچ ہزار روپے)، ہر سال ۶۰،۰۰۰ (ساٹھ ہزار روپے) اور پانچ سال میں ۳۰۰،۰۰۰ (تین لاکھ روپے) نفع زیادہ ملے گا۔

اب بالفرض زید کی شرکت کی مدت تو ختم ہوگئی لیکن بکر کی مدت ابھی پانچ سال مزید باقی ہے لیکن بعض وجوہ کی بنا پر بکر کو ابھی اپنا پیسہ نکالنے کی ضرورت پیش آگئی جس کی وجہ سے بکر نے کہا کہ میں اپنا پیسہ نکلوانا چاہتا ہوں اب بینک اس کو یہ کہتا ہے کہ آپ اپنا حصہ بینک کو ہی بیچ کر نکال سکتے ہیں جس کا طریقہ یہ ہوگا کہ میں (بینک) آپ (بکر) کے حصہ کی قیمت اتنی کم کر کے لگاؤں گا تا کہ یہ زیادہ نفع جو آپ (بکر) نے لیا ہے وہ مجھے واپس وصول ہو جائے لہٰذا بینک اس سے اس کا حصہ سات لاکھ میں خریدتا ہے تا کہ تین لاکھ نفع جو زید کے مقابلے میں زیادہ لیا تھا وہ واپس ہو جائے (جبکہ بکر کے اس حصے کے تین خریدار مثلاً اور بھی ہیں جن میں سے ایک دس لاکھ میں، دوسرا گیارہ لاکھ میں اور تیسرا بارہ لاکھ میں خریدنے کو تیار ہے اور اس خریداری میں وہ اپنا نفع سمجھتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ یہ تینوں اگر براہ راست بینک کے پاس مثلاً پانچ سال کے لیے رقم جمع کر کے اکاؤنٹ کھلواتے ہیں تو پانچ سال میں بکر کو جو تین لاکھ زیادہ ملنے والے تھے وہ نہیں ملیں گے کیونکہ اس صورت میں اس کے حصے کی شرح نفع فی لاکھ مثلاً ایک ہزار روپے نفع علی الحساب ہوگا اور بکر کا حصہ خریدنے کی صورت میں شرح نفع مثلاً فی لاکھ پندرہ سو ہوگا جس کے نتیجے میں پہلے خریدار کو تین لاکھ، دوسرے کو دو لاکھ اور تیسرے کو ایک لاکھ پانچ سال میں زیادہ نفع ملے گا۔ بینک اس (بکر) کو بینک ہی کو سات لاکھ میں بیچنے پر مجبور کرتا ہے اور دوسروں کو اس کے حصے کو زیادہ قیمت پر خریدنے سے روکتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ بینک تین لاکھ گزشتہ اور تین لاکھ آئندہ کل چھ لاکھ خود ہڑپ کرنا چاہتا ہے اور ایک مفتی صاحب کے قول کے حاصل کے پیش نظر: ''دونوں کا خون چوستا ہے'' اور اس چوسنے کے ثواب اور عقاب کا ذمہ دار علماء کو بناتا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ بینک اس دوسری قسم کے رب المال کے لیے حصہ فروخت کرتے وقت بازاری قیمت بھی نہیں لگاتا اور نہ ہی نفع دیتا ہے بلکہ بازاری قیمت سے اتنی کم قیمت لگاتا ہے جس کی وجہ سے گزشتہ سالوں میں لیا گیا بعض نفع بھی واپس ہو جائے۔

اعجوبہ : پچھلے ماہ تک بکر کا حصہ ہر ماہ پندرہ ہزار نفع کماتا رہا اس ماہ جب حصہ بیچنے لگا تو یکدم دھڑام سے اس کا حصہ تین لاکھ نقصان پر چلا گیا (حالانکہ اگر اس ماہ بیچنے کی بات نہ کرتا تو بھی اس کا حصہ پندرہ ہزار کا نفع کماتا بلکہ آئندہ پانچ سال تک کماتا) یہ ایک اعجوبہ ہو سکتا ہے، اس کو کون ذی فہم حقیقت کہہ سکتا ہے؟ نیز تعجب بالائے تعجب یہ ہے کہ اس کے دوست زید کے حصے کی قیمت اسی تاریخ میں بازار میں دس لاکھ لگ رہی ہے اس لیے اس کو دس لاکھ واپس دیے جا رہے ہیں اور بکر بیچارے کے حصہ کی قیمت اسی دن سات لاکھ لگ رہی ہے۔ ببین تفاوت راہ از کجا است تا بکجا......... جبکہ دونوں کا کاروبار مشترک ہے اور حصص کی حقیقت میں بازار کے اعتبار سے کوئی فرق بھی نہیں ہے۔

الحاصل ! نہ بینک کسی کے حصے کی بازاری قیمت لگاتا ہے اور نہ ہی یہ بیع وشراء ہے، اسی وجہ سے بینک کے بعض منیجروں کا کہنا ہے کہ ہم یہ بیع وشراء نہیں جانتے ہم تو ویٹ جانتے ہیں لہٰذا وقت سے پہلے نکلنے والے کے ویٹ کو ہم دیکھتے ہیں کہ اصل ویٹ کیا تھا اور اب جو وقت سے پہلے نکل رہا ہے تو اس وقت کا ویٹ کیا ہے؟ اور دونوں میں فرق کتنا ہے؟ اس فرق کو نکال کر اس کو کہا جاتا ہے کہ آپ جس مدت کے بعد نکل رہے ہو اس کا ویٹ مثلاً ہزار روپے فی لاکھ ہے اور تجویز شدہ وقت کا ویٹ مثلاً پندرہ سو ہے تو گویا آپ نے فی لاکھ ہر ماہ پانچ سو روپے زیادہ لیے اس لیے وہ زیادہ کاٹ کر آپ کی جو رقم بچے گی وہ آپ کو واپس دی جائے گی البتہ علماء کے ذمہ ان بینکوں کے چالاک مالکوں نے یہ کام لگا دیا ہے کہ ہماری اس غلط روش کو اسلامی لباس پہنانا آپ کے ذمہ ہے اس لیے علماء نے اس کو بیع قرار دیا ہے اگرچہ اس میں نہ تو بیع کی حقیقت ہے اور نہ شرائط اور نہ ہی بینک والوں کا یہ مقصد۔

بعض کی تاویل اور اس کا رد : بنا بر تسلیم بیع اس میں درج ذیل خلاف شرع امور ہیں:

(۱) حصہ کی نسبت کل کاروبار کے تناسب سے معلوم ہونا ضروری ہے اور یہ کاروبار کے ''حجم'' کے معلوم ہونے پر موقوف ہے اور ''کاروبار کا حجم'' کسی کو معلوم نہیں کیوں کہ اس کا حجم سرمایہ کے بدلنے سے بدلتا رہتا ہے۔

(۲) نکلنے والے رب المال کو حصہ بیچنے میں شرعاً تین اختیار حاصل ہیں:

(الف) بینک کو بیچے۔

(ب) کسی قدیم شریک کو بیچے۔

(ج) کسی اجنبی (غیر شریک) کو بیچے۔

جیسا کہ دارالعلوم کراچی کے تصدیق شدہ مضاربت نامہ میں عقدِ مضاربت ختم کرنے کی صورتوں میں تحریر ہے :

''فریق اول اپنے متناسب اثاثے باہمی رضامندی سے کسی تیسرے فریق کو بیچ دے۔ اس صورت میں وہ شخص فریق اول کی جگہ رب المال کی حیثیت میں آجائے گا اور اس کے ساتھ معاملے کی وہی شرائط وتفصیلات ہوں گی جو اس وقت فریق اول مذکور کے ساتھ ہیں''۔ (فتویٰ نمبر ۱۳۲۷/۵۴، از دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی)

جبکہ بینک اس کے اس شرعی اختیار کو سلب کر کے بینک ہی کو فروخت کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

(۳) بیع میں تراضی شرط ہے اور یہ علمِ بیع پر موقوف ہے جبکہ اکثریت کو یہ علم ہی نہیں کہ یہ بیع ہو رہی ہے بلکہ خود بینک کے اس شعبے سے متعلق افسران کو بھی معلوم نہیں کہ یہ بیع ہے۔

قال العلامة الزيلعي رحمه الله تعالىٰ : هُوَ مُبَادَلَةُ الْمَالِ بِالْمَالِ بِالتَّرَاضِي وَهٰذَا فِي الشَّرْعِ وَفِي اللُّغَةِ هُوَ مُطْلَقُ الْمُبَادَلَةِ مِنْ غَيْرِ تَقْيِيدٍ بِالتَّرَاضِي وَكَوْنُهُ مُقَيَّدًا بِهِ ثَبَتَ شَرْعًا لِقَوْلِهِ تَعَالَى ﴿إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ﴾ .

(تبيين الحقائق ۴ / ۲، ط:امداديه)

(۴) تراضی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ بائع اور مشتری دونوں کو ثمن معلوم ہو کہ اس وقت مارکیٹ ویلیو کے حساب سے اس حصے کی قیمت اور ثمن اتنا ہے جبکہ بائع اور مشتری دونوں کو اس کا علم نہیں ہوتا کیونکہ اس علم کے لیے کئی مارکیٹوں کا چکر لگانا ناگزیر ہے جس کا تحمل بینک نہیں کر سکتا اور کمپیوٹر میں ایسا پرزہ ابھی تک ایجاد نہیں ہوا جس کے دبانے سے مختلف اثاثوں کی مختلف کنڈیشنز کے مطابق فی الحال موجودہ مارکیٹ ویلیو یکدم اسکرین پر نمایاں ہو جائے۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ تحت قوله : (قَوْلُهُ إِنْ قَبْلَ الْقَبْضِ لَمْ

۸

يَصِحَّ) ......قلت : وَمِثْلُهُ قَوْلُهُ فِي الذَّخِيرَةِ : اشْتَرَى شَيْئًا ثُمَّ أَشْرَكَ آخَرَ فِيهِ فَهٰذَا بَيْعُ النِّصْفِ بِنِصْفِ الثَّمَنِ الَّذِي اشْتَرَاهُ بِهِ . اهـ. وَمُقْتَضَاهُ أَنَّهُ يَثْبُتُ فِيهِ بَقِيَّةُ أَحْكَامِ الْبَيْعِ مِنْ ثُبُوتِ خِيَارِ الْعَيْبِ وَالرُّؤْيَةِ وَنَحْوِهِ وَأَنَّهُ لَا بُدَّ مِنْ عِلْمِ الْمُشْتَرِي بِالثَّمَنِ فِي الْمَجْلِسِ. (الشامية ۶ / ۵۰۲ ط رشيدية)

(۵) اس کے حصے کا ایک جزء مرابحاتِ مؤجلہ کی وجہ سے دوسروں کے ذمے دین اور ادھار ہوتا ہے اور دین کی بیع ''مَن عليه الدين'' سے تو جائز ہے لیکن ''من غير مَن عليه الدين'' سے جائز نہیں اور بینک ''من غير مَن عليه الدين'' میں سے ہے۔ لہٰذا یہ جزء اس پر بیچنا بھی جائز نہ ہوگا۔

حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

''یہ معاملہ دو وجہ سے ناجائز اور حرام ہے۔ ایک یہ کہ یہ بیع الدین من غیر من علیہ الدین ہے، جو ناجائز ہے......(احسن الفتاوی ۷/۱۷۶)

(۶) اس کے حصے کا ایک جزء نقد کرنسی بھی ہے، جس کی بیع ''بیع الفلس بالفلس'' ہے اور اس میں بالاتفاق ''نسیئہ'' حرام ہے، کیونکہ ملکی کرنسی بالاتفاق جنس واحد ہے اور جنس تنہا ''حرمتِ نسیئہ'' کے لیے کافی ہے۔

قال العلامة المرغيناني رحمه الله تعالىٰ : وَبِخِلَافِ مَا إِذَا كَانَ أَحَدُهُمَا بِغَيْرِ عَيْنِهِ لِأَنَّ الْجِنْسَ بِانْفِرَادِهِ يُحَرِّمُ النَّسَاءَ. (الهداية ۳/۸۶، ط:رحمانيه)

''نسیئہ'' کی صورت یہ ہے کہ اکاؤنٹ ہولڈر بینک کے ذریعے خرید وفروخت اور ادائیگیاں کرتا ہے، اس میں غور طلب بات یہ ہے کہ اس نے بینک سے عقد کب کیا؟ چیک لکھنے کے وقت یا کسی کو چیک دیتے وقت یا لینے والے کا اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرتے وقت یا ایک بینک کا دوسرے بینک کو اطلاع دیتے وقت یا دوسرے بینک کو رقم بھیجتے وقت۔ غرضیکہ ان میں سے کوئی بھی صورت ہو نسیئہ سے خالی نہیں۔

مندرجہ بالا ناجائز وجوہ اور ان جیسی دوسری کئی ناجائز وجوہ کی بنا پر ملک کے کئی نامور، جید اور مقتدر مفتیانِ کرام نے اسلامی نامی بینکوں کے نظام کو خلافِ شرع قرار دے کر اس کو مسترد کرتے ہوئے اس کو ناجائز فرمایا ہے۔ چنانچہ ملک کے مختلف اطراف کے اہل فتویٰ علمائے کرام کا ایک اجلاس 25 شعبان المعظم 1429ھ بمطابق 28 اگست 2008ء بروز جمعرات حضرت شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان صاحب دامت برکاتہم کی زیر صدارت جامعہ فاروقیہ کراچی میں منعقد ہوا۔

اجلاس میں شریک مفتیانِ عظام نے متفقہ طور پر یہ فتویٰ دیا کہ اسلام کی طرف منسوب مروجہ بینکاری قطعی غیر شرعی اور غیر اسلامی ہے، لہٰذا ان بینکوں کے ساتھ اسلامی یا شرعی سمجھ کر جو معاملات کیے جاتے ہیں وہ ناجائز اور حرام ہیں اور ان کا حکم دیگر سودی بینکوں کی طرح ہے۔

اس اجلاس کے شرکاء نے اس بات پر بھی اتفاق کا اظہار کیا کہ جدیدیت کی رو میں بہہ کر تصویر کی حرمت کا حکم نہیں بدلا جا سکتا ہے۔ جاندار کی تصویر کی جتنی اور جو شکلیں اب تک متعارف ہوئی ہیں، عرف و عادت بلغت اور شرعی نصوص کی رو سے وہ سب تصویر کے حکم میں ہیں۔ آلاتِ صنعت و حرفت کے بدلنے سے تصویر کے شرعی احکام نہیں بدلتے۔ اس لیے جو حکم شریعت میں تصویر کا منقول ہے تصویر کی تمام شکلیں اس حکم کے تحت داخل ہیں۔ اس لیے تصویر کی اباحت اور جواز کا راستہ اختیار کرتے ہوئے کسی قسم کے ٹی وی چینل کا اجراء یا علماء کرام کا ٹی وی پر آنا اور اسے تبلیغِ دین کی ضرورت کہنا اور سمجھنا شریعت کی خلاف ورزی ہے اور جدیدیت و اباحیت کی ناجائز پیروی ہے۔

مسلمانوں پر واجب اور لازم ہے کہ دیگر حرام اور خلافِ شرع امور کی طرح ان سے بھی بچنے کا بھرپور اہتمام فرمائیں۔

ان مفتیانِ کرام میں سے چند کے نام یہ ہیں :

(١) حضرت مولانا مفتی حمید اللہ جان صاحب مدظلہ العالی
(٢) حضرت مولانا مفتی زرولی خان صاحب مدظلہ العالی
(٣) حضرت مولانا مفتی عبدالمجید دین پوری صاحب شہید رحمہ اللہ تعالیٰ
(٤) حضرت مولانا مفتی حبیب اللہ شیخ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ
(٥) حضرت مولانا مفتی عبداللہ صاحب مدظلہ العالی
(٦) حضرت مولانا مفتی گل حسن صاحب مدظلہ العالی
(٧) حضرت مولانا مفتی روزی خان صاحب مدظلہ العالی
(٨) حضرت مولانا مفتی انعام الحق صاحب مدظلہ العالی
(٩) حضرت مولانا مفتی سمیع اللہ صاحب مدظلہ العالی
(١٠) حضرت مولانا مفتی عبدالغفار صاحب مدظلہ العالی

الحاصل : عدمِ جواز کی مندرجہ بالا وجوہ اور اکابر مفتیانِ کرام کے عدمِ جواز کے فتاویٰ کے بعد بینکوں کا غیر مدلل فتاویٰ شائع کرنا اور اس کے ذریعے عوام الناس کو اس حرام میں مبتلا کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں، جو اس طرح کرے گا وہ بھی گناہ میں شریک ہوگا۔

محمد عثمان زاہد
دارالافتاء جامعہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم
مدنی کالونی ماری پور گریکس کراچی
٥ / ٩ / ١٤٣٥ھ

﴿بعض غلط فہمیوں کا ازالہ﴾

﴿۱﴾ کسی نامور شخصیت کی رائے اور تحقیق کو محض اس کی شخصیت کی بناء پر مدلل رائے اور تحقیق پر ترجیح دینا :

آج کل عام ذہن یہ ہے کہ اگر کسی نامور اور مشہور شخصیت کی ایسی رائے اور تحقیق (جو بلا دلیل ہو یا مرجوح اور شاذ اقوال کی مرہونِ منت ہو) کے خلاف کوئی تحریراً یا تقریراً ایسی رائے اور تحقیق پیش کرے جو مدلل ہو اور اقوالِ راجحہ پر مبنی ہو تو نہ تو اس مدلل رائے اور تحقیق کو سنا جائے اور نہ ہی اس کو قبول کیا جائے حالانکہ یہ ذہنیت خلافِ اصول ہونے کی وجہ سے باطل ہے۔ علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کسی شخصیت کی شہرت کی وجہ سے مدلل بات کے رد کرنے کو ناجائز، جہلِ عظیم، احکامِ شرعیہ کو ٹھکرانے میں تہوّر اور دیدہ دلیری و بے باکی کہا ہے۔

کسی کی رائے اور تحقیق کے راجح اور معمول بہ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ رائے اور تحقیق قوی دلائل اور اقوالِ راجحہ پر مبنی ہو، محض قائل کے عظیم المرتبہ ہونے یا اس کی شہرت اور علمی مقام سے اس کی رائے اور تحقیق کو ہرگز ہرگز راجح نہیں کہا جاسکتا۔

مخلوق کو اللہ تعالیٰ کے ارشاد، امتی کو رسول اللہ ﷺ کے فرمان اور مقلد کو مجتہد کے اجتہاد میں چوں و چرا کا نہ حق حاصل ہے اور نہ ہی جائز ہے لیکن غیر مجتہد عالم کی رائے اور تحقیق پر علماء کو کلام کا حق حاصل ہے اور جہاں کسی عالم کی رائے اور تحقیق کے خلاف دوسرے ہم عصر علماء نے کلام کیا ہو وہاں علماء کے لیے فریقین کے دلائل میں غور کیے بغیر آنکھیں بند کرکے شخصیت اور شہرت کی وجہ سے کسی کی رائے اور تحقیق کو راجح قرار دینا اور عمل کرنا جائز نہیں۔ ایسی صورت میں علمائے عصر پر لازم ہے کہ دلائل میں سنجیدگی اور انصاف سے، خالی الذہن ہو کر غور کریں اور جو رائے اور تحقیق دلائل اور اقوالِ راجحہ پر مبنی ہو، اسے قبول کریں اگرچہ وہ مدلل رائے اور تحقیق کسی غیر معروف اور چھوٹے درجے کے عالم کی طرف منسوب کیوں نہ ہو۔

علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے تو ان جبال العلم والفقہ جو آپ کے ہم عصر بھی نہ تھے بلکہ صدیوں پہلے گزرے ہیں، کی اس رائے اور تحقیق پر بھی کلام کرکے اس کو رد کیا ہے جو دلیل پر مبنی نہ تھی اور حضرات علمائے کرام اور محققین رحمہم اللہ تعالیٰ نے آپ کے اس کلام اور رد کو بنظرِ استحسان دیکھ کر قبول کیا ہے۔ کسی ایک معتبر عالم کا حوالہ پیش نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ کے اس صنیع اور طرزِ عمل پر اعتراض کر کے کہا ہو کہ ان متقدمین کی شہرت اور مرتبہ کی وجہ سے ہم علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ کی مدلل تحقیق کو رد کرتے ہیں ،جبکہ آج یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ ہم عصر، شہرت یافتہ عالمِ دین کی اس رائے اور تحقیق جو بلا دلیل ہو یا کمزور دلائل

اور اقوالِ مرجوحہ پر مبنی ہو، کے خلاف بھی کسی عالمِ دین کو مدلل رائے اور تحقیق پیش کرنے کا حق نہ مانا جاتا ہے نہ اسے سنا جاتا ہے۔ علمائے کرام سے گزارش ہے کہ اس سوچ اور باطل نظریہ سے توبہ کرکے فریقین کے دلائل میں انصاف سے غور کرکے مدلل تحقیق کو قبول کیجیے اور ذیل میں علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ کی ''شرح عقود رسم المفتی'' میں بیان کردہ باتوں کو بار بار پڑھیے، ان شاء اللہ تعالیٰ ذہن کی خوب صفائی ہوجائے گی۔

؎ شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات

(۱) علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :ایک مرتبہ وقف سے متعلق میں نے ایک فتویٰ دیا جو مذہب کی عام کتابوں کے موافق تھا، اس مسئلہ میں عمدۃ المتاخرین'' علامہ علاء الدین حصکفی رحمہ اللہ تعالیٰ'' (صاحب الدر المختار) پر معاملہ مشتبہ ہوگیا ہے، انہوں نے ''درمختار'' میں اس مسئلہ کو خلافِ صواب ذکر فرمایا ہے، میرا وہ فتویٰ ملک کے بعض مفتیان کے ہاتھ لگ گیا، انہوں نے اس کی پشت پر میرے فتویٰ کے خلاف اور ''درمختار'' کے مطابق فتویٰ لکھا اور بعض نے تو یہ بھی لکھا کہ ''علائی'' اور ''درمختار'' میں جس طرح مسئلہ ہے وہی ''معمول بہا'' ہے کیوں کہ وہ متاخرین میں عمدہ اور معتمد علیہ ہیں، نیز یہ بھی لکھا کہ ''اگر تمہارے پاس اس کے خلاف دلیل بھی ہے تو بھی ہم اس کو قبول نہیں کریں گے''۔

علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: دیکھا آپ نے یہ جہلِ عظیم، احکامِ شرعیہ کو ٹھکرانے میں تہوّر اور دیدہ دلیری و بے باکی اور کتابوں کی طرف مراجعت کیے بغیر اور علم کے بغیر فتویٰ نویسی پر اقدام! کاش ان صاحبوں نے علامہ ابراہیم حلبی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ''درمختار'' کا حاشیہ ہی دیکھ لیا ہوتا کیوں کہ وہ ان کو بآسانی دستیاب ہوسکتا تھا، حلبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر تنبیہ کی ہے کہ علائی رحمہ اللہ تعالیٰ نے جو لکھا ہے وہ مسئلہ کی صحیح تعبیر نہیں۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ : وقد كنت مرة افتيت بمسألة فى الوقف موافقا لما هو المسطور فى عامة الكتب وقد اشتبه فيها الامر على الشيخ علاء الدين الحصكفى عمدة المتاخرين فذكر فى الدر المختار على خلاف الصواب فوقع جوابى الذى افتيت به بيد جماعة من مفتي البلاد ، كتبوا فى ظهره بخلاف ما افتيت به موافقين لما وقع فى الدر المختار وزاد بعض هؤلاء المفتين ان هذا الذى فى العلائى هو الذى عليه العمل لانه عمدة المتاخرين وانه ان كان عندكم خلافه لانقبل منكم فانظر الى هذا الجهل العظيم والتهور فى الاحكام الشرعية و الاقدام على الفتيا بدون علم و بدون مراجعة . وليت هذا القائل راجع حاشية العلامة الشيخ ابراهيم الحلبى على الدر المختار فانه اقرب مايكون اليه فقد نبه فيها على انه ماوقع للعلائى

خطأ في التعبير. (شرح عقود رسم المفتي، ص: ۱۷، ط: البشریٰ)

دیکھیے! علامہ علاء الدین حصکفی رحمہ اللہ تعالیٰ کو خود علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ عمدۃ المتاخرین فرماتے ہیں پھر بھی ان کی غیر مدلل اور خلافِ صواب رائے پر جمود، اور صحیح اور مدلل بات کے انکار کو جہلِ عظیم اور احکامِ شرعیہ کو ٹھکرانے میں تہوّر اور دیدہ دلیری و بے باکی فرما رہے ہیں۔

واضح رہے کہ علامہ حصکفی رحمہ اللہ تعالیٰ کی وفات ۱۰۸۸ھ میں ہوئی یعنی علامہ حصکفی رحمہ اللہ تعالیٰ گیارہویں صدی کے فقیہ ہیں، جبکہ علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ کی ولادت ۱۱۹۸ھ میں اور وفات ۱۲۵۲ھ میں ہوئی گویا آپ تیرہویں صدی کے فقیہ ہیں اور دونوں میں ۱۶۴ سال (تقریباً دو صدی) کا فاصلہ ہے یعنی علامہ حصکفی رحمہ اللہ تعالیٰ جو عمدۃ المتاخرین ہیں، ۱۶۴ سال پہلے گزرے ہیں، پھر بھی علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے آپ رحمہ اللہ تعالیٰ کی غیر مدلل اور خلافِ صواب تحقیق کو قبول نہیں کیا۔

کیا آج کی کوئی نامور شخصیت، اور فقیہ علامہ حصکفی رحمہ اللہ تعالیٰ (جو عمدۃ المتاخرین مانے گئے ہیں) سے بھی اونچے درجے کے ہیں کہ ان کی تحقیق اور رائے پر کلام کرنا ناجائز، گستاخی اور ناقابلِ سماعت سمجھا جائے؟

(۲) علامہ ابنِ کمال پاشا رحمہ اللہ تعالیٰ جو کہ علمائے احناف رحمہم اللہ تعالیٰ میں بڑے پائے کے محدث اور فقیہ تھے، انہوں نے شراحِ ہدایہ پر رد کرتے ہوئے یہ تحقیق پیش کی کہ ''ظاہر الروایہ'' اور ''روایۃ الاصول'' میں عموم خصوص مطلق کی نسبت ہے۔ ظاہر الروایہ عام مطلق ہے اور روایۃ الاصول خاص مطلق ہے۔ یعنی ہر روایۃ الاصول، ظاہر الروایہ ہے لیکن ہر ظاہر الروایہ، روایۃ الاصول نہیں۔ کیونکہ ''روایۃ الاصول'' کتبِ ستہ کے ساتھ خاص ہے'' اور ظاہر الروایہ'' نوادر کی روایات کو بھی کہتے ہیں۔

علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''شرح عقود رسم المفتی'' میں ابنِ کمال پاشا رحمہ اللہ تعالیٰ کی دلیل کا ضعف بتا کر ان کی تحقیق کو رد کیا ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو شرح عقود رسم المفتی، ص: ۲۲)

تنبیہ: علامہ ابنِ کمال پاشا رحمہ اللہ تعالیٰ کی وفات ۹۴۰ھ میں ہوئی اور علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ کی ولادت ۱۱۹۸ھ میں ہوئی، یعنی دونوں میں ڈھائی صدی سے زیادہ فرق ہے، پھر بھی علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان کے علمی مقام و مرتبے اور قدامت کی پروا کیے بغیر ان کی تحقیق کو دلائل کی روشنی میں پرکھ کر رد فرمایا ہے اور کسی نے علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ پر یہ اعتراض نہیں کیا کہ یہ کیا ظلم کر دیا کہ اتنے بڑے مشہور فقیہ اور متقدم کی تحقیق کو رد کیا جا رہا ہے جبکہ آج معاصر کی تحقیق کے رد پر شور مچ جاتا ہے۔

سوچیے تو سہی! ہم علمی میدان اور اس کے آداب اور تحقیقات پر غور کے طور طریقوں سے کتنے نابلد ہیں؟

کیا عصرِ حاضر کے نامور علمائے کرام کا مقام اور فقہ میں درجہ علامہ ابن کمال پاشا رحمہ اللہ تعالیٰ جو حنفی فقیہ

اور محدثِ کبیر ہیں، سے بھی بڑھا ہوا ہے؟ کہ ان کی رائے کے خلاف کچھ بھی سننے سے انکار کیا جائے؟ اور براہینِ قاطعہ بدیہیہ دیکھنے اور ان پر غور کرنے کے لیے کسی بھی صورت میں آمادہ نہ ہوں؟

الحاصل! واضح رہے کہ قرآن و حدیث یا کسی مجتہد کی بات کو تو بلا دلیل اور بغیر حکمت جانے قبول کیا جائے گا لیکن ان کے علاوہ بڑے سے بڑا عالم ہی کیوں نہ ہو، ان کی بات کو بلا دلیل تسلیم نہیں کیا جا سکتا خصوصاً جبکہ وہ بات بدیہی طور پر دلائل شرعیہ کے خلاف ہو یا ضعیف اور مرجوح اقوال پر مبنی ہو۔

﴿۲﴾ کسی شخصیت کے قول کی تضعیف سے اس کے قائل اور شخصیت کی تضعیف ہرگز لازم نہیں آتی، چنانچہ حضرات فقہائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کے اختلافی اقوال اس پر واضح دلیل ہیں۔ احناف رحمہم اللہ تعالیٰ، شوافع، حنابلہ اور مالکیہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے اقوال کی تضعیف بھی ثابت کرتے ہیں اور اس کے باوجود ان حضرات کی عظمت و احترام میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں ہوتی اور نہ کوئی اس سے ان حضرات کو ضعیف سمجھتا ہے۔

مفتی اعظم حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

> عظمت کا قائل ہونا الگ چیز ہے اور رائے مختلف ہونا اور چیز ہے، قول کی تضعیف سے قائل کی تضعیف نہیں ہوتی، ہم حدیث کی مباحث میں بہت سے اقوال کی تضعیف کرتے ہیں مگر ان کے قائلین کی عظمت ہمارے قلوب سے محو نہیں ہو سکتی، اسی طرح ایک وقت امام مسلم رحمہ اللہ تعالیٰ امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کو ''منتحل الحدیث'' کہتے ہیں تو دوسرے وقت امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کی پیشانی پر بوسہ دے کر عرض کرتے ہیں: دعني اقبل رجليك يا استاذ الاستاذين ويا سيد المحدثين ويا طبيب الحديث في علله. (ارشاد القاری الی صحیح البخاری، ص: ۳۶)

چونکہ عوام اور سطحی ذہن کے علماء اس اصل سے واقف نہیں اس لیے جس شخصیت کی رائے کی مخالفت کی جاتی ہے وہ خود بھی اور اس کے حواری اور حمایتی بھی عوام الناس کے ذہنوں میں مخالفین کی نفرت ڈالنے کے لیے یہ کہتے رہتے ہیں کہ فلاں اکابر کے خلاف ہے، فلاں کے دل میں اکابر کی عظمت نہیں، فلاں اکابر کے خلاف لکھتا اور بولتا رہتا ہے۔ اگر یہ لوگ ایسا دیدہ و دانستہ کرتے ہیں تو درخواست ہے کہ اس روش سے توبہ کرنی چاہیے اور اگر غلط فہمی میں مبتلا ہیں تو اس تحریر اور حقائق سے غلط فہمی کو دور کرنا چاہیے۔

﴿۳﴾ راجح قول پر عمل کرنا اور فتویٰ دینا واجب ہے اور راجح کو چھوڑ کر مرجوح پر عمل کرنا اور فتویٰ دینا اتباع ہویٰ اور حرام ہے اتفاقاً و اجماعاً۔

حوالہ جات ملاحظہ ہوں:

(۱) واعلم بان الواجب اتباع ما ترجیحه عن اهله قد علما.

(شرح عقود رسم المفتی ص: ۷)

اس شعر میں ''الواجب'' کالفظ بتارہا ہے کہ راجح قول پر عمل اور فتویٰ واجب ہے اور ظاہر ہے کہ جب راجح پر واجب ہے تو اس کے خلاف مرجوح پر حرام ہوگا۔

(۲) وقد نقلوا الاجماع علی ذلک فی الفتاوی الکبری للمحقق ابن حجر المکی: قال فی زوائد الروضة انه لایجوز للمفتی والعامل ان یفتی او یعمل بما شاء من القولین او الوجهین من غیر نظر وهذا لاخلاف فیه وسبقه الی حکایة الاجماع فیهما ابن الصلاح والباجی من المالکیة فی المفتی وکلام القرافی دال علی ان المجتهد والمقلد لایحل لهما الحکم والافتاء بغیر الراجح لانه اتباع للهوی وهو حرام اجماعا. (شرح عقود رسم المفتی، ص: ۸)

دیکھیے! اس عبارت میں ترجیح میں غور کیے بغیر فتویٰ اور عمل کو اتفاقاً ناجائز کہا ہے اور مرجوح پر فتویٰ دینے کو اتباع ہویٰ اور نفس پرستی کہہ کر بالاجماع حرام قرار دیا ہے۔

(۳) علامہ قاسم ابن قطلوبغا رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

سمعت من لفظ بعض القضاة: هل ثم حجر؟ فقلت: نعم! اتباع الهوی حرام والمرجوح فی مقابلة الراجح بمنزلة العدم والترجیح بغیر مرجح فی المتقابلات ممنوع. (شرح عقود ص: ۸)

دیکھیے! محقق ابن الہمام رحمہ اللہ تعالیٰ کے شاگرد رشید علامہ قاسم بن قطلوبغا رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اس کو اتباع ہویٰ قرار دے کر حرام فرمایا ہے۔

(۴) وقال فی کتاب الاصول للیعمری: من لم یطلع علی المشهور من الروایتین او القولین فلیس له التشهی والحکم بماشاء منهما من غیر نظر فی الترجیح. (شرح عقود ص: ۸)

روایتِ مشہورہ، راجحہ پر عدمِ اطلاع کی صورت میں ترجیح میں غور کیے بغیر عمل اور فتویٰ کو ''تشہی'' (خواہشاتِ نفس پر چلنا) کہا گیا ہے تو جب راجح اور مرجوح دونوں معلوم ہوں لیکن راجح سے مجوزہ مقصد حاصل نہ ہوتا ہو اس لیے اس کو چھوڑ کر مرجوح کو معمول بہ بنایا جائے تو اس صورت کا کیا حکم ہوگا؟

حضرت عبداللہ بن مسعود ﷺ نے سچ فرمایا ہے کہ ''تم اس زمانے میں ہو کہ خواہشات علم کے تابع

ہیں، عنقریب تم پر ایسا زمانہ آنے والا ہے جس میں علم خواہشات کے تابع ہوگا''۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ افسوس سے فرمایا کرتے تھے کہ ''لوگوں نے علم (یقینی دلائل اور واضح باتوں) کو چھوڑا اور غرائب (نا آشنا باتوں اور مجہول وکمزور دلائل) میں پڑ گئے۔ ہائے! ان میں علم کتنا کم ہے''؟

حضرت امام مالک بن انس رحمہ اللہ تعالیٰ نے کتنی عجیب بات ارشاد فرمائی ہے کہ ''(ایک زمانہ ایسا تھا کہ) لوگ حلال وحرام سے خوب واقف تھے، وہ مستحبات اور مکروہات معلوم کرکے اہتمام کرنے والے تھے یعنی ان کے سامنے حلال وحرام خوب ظاہر تھا، حرام سے بچنے کے ساتھ ساتھ مکروہات سے بھی بچتے تھے اور حلال کے اہتمام کے ساتھ ساتھ مستحبات کا خیال بھی رکھتے تھے جبکہ تم صرف یہی پوچھتے ہو کہ حلال ہے یا حرام؟'' گویا مستحب اور مکروہ کا اہتمام ہی نہیں۔

الحاصل! وہ لوگ اس معاملے میں تم سے بہت آگے تھے۔

وقال الامام الغزالی رحمه الله تعالیٰ: ولقد صدق ابن مسعود ﷺ حیث قال انتم الیوم فی زمان الهوی فیه تابع للعلم وسیأتی علیکم زمان یکون العلم فیه تابعا للهوی وقد کان أحمد بن حنبل یقول ترکوا العلم وأقبلوا علی الغرائب ما أقل العلمَ فیهم والله المستعان وقال مالک بن أنس رحمه الله تعالیٰ لم تکن الناس فیما مضی یسألون عن هذه الأمور کما یسأل الناس الیوم ولم یکن العلماء یقولون حرام ولا حلال ولکن أدرکتهم یقولون مستحب ومکروه ومعناه أنهم کانوا ینظرون فی دقائق الکراهة والاستحباب فأما الحرام فکان فحشه ظاهرا.

(احیاء العلوم ۱/۱۱۷، ط: قدیمی)

حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں: ''حضرت عبداللہ ابن مسعود ﷺ کا ارشاد ہے: کہ تم لوگ ایسے زمانے میں ہو کہ اس وقت خواہشات علم کے تابع ہیں لیکن عنقریب ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ علم خواہشات کے تابع ہوگا یعنی جن چیزوں کو اپنا دل چاہے گا وہی علوم سے ثابت کی جائیں گی''۔ (فضائلِ صدقات، ص: ۴۹۵)

تنبیہ: یاد رکھیے کہ شخصی اور نجی ضرورت اس سے مستثنیٰ ہے، لہٰذا مضطر (مجبور) اور ضرورت مند شخص کے لیے بوقتِ اضطرار (مجبوری) اور ضرورت، ضعیف اور مرجوح قول پر عمل کی گنجائش ہے، اسی طرح مفتی کے لیے بھی گنجائش ہے کہ ایسے شخص کو ضعیف اور مرجوح قول پر فتویٰ دے کر عمل کی گنجائش دے، چنانچہ علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

۷

ولا يجوز بالضعيف العمل ولا به يجاب من جاء يسئل
الا لعامل له ضرورة او من له معرفة مشهورة

وقد ذكر صاحب البحر في الحيض في بحث الوان الدماء اقوالا ضعيفة ثم قال: وفي المعراج عن فخر الائمة: لو افتى مفت بشيء من هذه الاقوال في مواضع الضرورة طلبا للتيسير كان حسنا وبه علم ان المضطر له العلم بذلك لنفسه كما قلنا وان المفتي له الافتاء به للمضطر فما مر من انه ليس له العمل بالضعيف والافتاء به ، محمول على غير موضع الضرورة كما علمته من مجموع ما قررناه والله تعالى اعلم. (شرح عقود رسم المفتي،ص:۸۴،۸۷،ط:البشرى)

﴿۴﴾ جدید مسائل کو سمجھنے کے لیے عصری علوم میں مہارت ضروری نہیں:

آج کل طرفہ تماشا یہ بھی ہے کہ لوگ بلکہ علماء تک مسائل شرعیہ کے احکام کو سمجھنے اور بتانے کے لیے عصری فنون خصوصاً انگریزی دانی، مغربی معاشیات اور بینکنگ میں مہارت کو ضروری سمجھنے لگے ہیں جبکہ جدید معاملات کے مسائل کو سمجھنے کے لیے انگریزی دان، ماہرِ معاشیات یا ماہرِ بینکنگ ہونا ہرگز ضروری نہیں بلکہ محض فقہی مسائل سے واقفیت بھی کافی ہے۔ قرونِ مشہود لہا بالخیر سے لے کر ماضی قریب تک کے تمام علماء اس حقیقت پر متفق چلے آرہے ہیں، خود مفتی تقی عثمانی صاحب زید مجدہم نے بھی اپنی کتاب غیر سودی بینکاری میں اسی حقیقت کو لکھا ہے، چنانچہ تحریر فرماتے ہیں :

"واقعہ یہ ہے کہ فقہی مسائل چاہے معاشی یا مالی معاملات سے متعلق ہوں ان کا شرعی حکم جاننے یا بتانے کے لیے ایک مفتی کا نہ ماہرِ معاشیات ہونا ضروری ہے، نہ بینکنگ کا ماہر ہونا اور نہ انگریزی زبان سے واقف ہونا، البتہ ایک بات جس طرح دوسرے مسائل میں ضروری ہے ان مسائل میں بھی ناگزیر ہے اور وہ یہ کہ جس بات پر وہ کوئی حکم لگا رہا ہے اس کی صحیح صورتِ مسئلہ اسے پوری وضاحت کے ساتھ معلوم ہو کیونکہ فتویٰ کا حکم اسی صورت پر لگتا ہے اور "الحکم علی الشیء فرع عن تصورہ" اگر کسی مفتی کے سامنے غلط صورتِ واقعہ بیان کی جائے تو یقیناً اس کا فتویٰ اسی غلط صورت کے مطابق ہوگا جو نفس الامر کے مطابق نہیں ہوگا"۔ (غیر سودی بینکاری، ص:۵۵)

کاش متاثرین جدیدیت بھی اس اتفاقی حقیقت کو مان کر اپنے نظریات وخیالات کو اسلاف کے متفقہ نظریات کے مطابق بنا لیتے !!!!!

﴿۵﴾ خلاف اور اختلاف میں فرق: اگر کسی مسئلہ میں مختلف اقوال دلائل پر مبنی ہوں تو اس

۲۸

صورت میں علمی میدان میں کہا جاتا ہے کہ اس مسئلہ میں "اختلاف" ہے جو کہ جائز اور محمود ہے اور اگر دلائل پر مبنی نہیں تو اس کو "خلاف" کہا جاتا ہے، جو کہ مذموم اور برا ہے۔ دوسری صورت کے اختیار کرنے والے کو کہا جائے گا کہ اس نے اس مسئلہ کی اتفاقی حقیقت کے خلاف کیا ہے، یہ کہنا کہ اس مسئلہ میں فلاں کا اختلاف ہے یا یہ اختلافی مسئلہ ہے، صحیح نہیں۔

اسی طرح راجح کے مقابلہ میں مرجوح قول بھی "خلاف" ہوتا ہے لہٰذا جو مرجوح قول کے مطابق فتویٰ اور حکم بتاتا ہے اس کے بارے میں بھی یہی کہا جائے گا کہ اس نے اتفاقی حقیقت کے خلاف کیا ہے، اس صورت میں بھی یہ کہنا کہ اس مسئلہ میں فلاں کا "اختلاف" ہے یا یہ اختلافی مسئلہ ہے، صحیح نہیں۔

"کشاف اصطلاحات الفنون" میں اختلاف اور خلاف کے اس فرق کو بایں الفاظ واضح کیا گیا ہے:

الاختلاف لغة ضد الاتفاق قال بعض العلماء ان الاختلاف يستعمل في قول بني على الدليل والخلاف فيما لا دليل عليه كما في بعض حواشي الارشاد ويؤيده مافي غاية التحقيق منه ان القول المرجوح في مقابلة الراجح يقال له خلاف لا اختلاف. ... والحاصل منه ثبوت الضعف في جانب المخالف في الخلاف فانه كمخالفة الاجماع و عدم ضعف جانب في الخلاف لانه ليس فيه خلاف ما تقرر، انتهى. (كشاف اصطلاحات الفنون ۲/۵۷، ط:دار الكتب العلميه،بيروت)

وقال العلامة المرغيناني رحمه الله تعالى : وفي ما اجتمع عليه الجمهور لايعتبر مخالفة البعض وذلك خلاف وليس باختلاف والمعتبر الاختلاف في الصدر الاول. (الهداية ، كتاب آداب القاضي،فصل في قضاء المرأة ۳/۱۴۲ ، ط:شركة علميه)

﴿۶﴾ خلاف کے نقصانات میں سے دو اہم نقصان یہ ہیں:

(۱) **اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں۔** اس لیے کہ دلیل اور راجح قول پر مبنی بات شریعت ہے اور اس کے خلاف کرنا خلافِ شرع ہے اور خلافِ شرع بات سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں۔ ہم چونکہ انسان ہیں لہٰذا انسان ہونے کی بنا پر غلط فہمی ہو جاتی ہے لیکن غلط فہمی والا گنہگار نہیں ہوتا، البتہ حقیقت یہی ہے کہ اگر کوئی دیدہ و دانستہ دلیل پر مبنی بات کو چھوڑے گا اور اس کے خلاف کرے گا تو وہ گنہگار ہوگا۔

الحاصل! دلیل پر مبنی بات شریعت ہے اور بغیر دلیل کے اس کے خلاف کرنا اور اس کا انکار کرنا خلافِ شرع ہے اور خلافِ شرع امر سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں۔

(۲) **ایک ناجائز کی خاطر کئی ناجائز کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے۔** یعنی جب آپ نے دلیل اور راجح قول پر مبنی بات کو چھوڑا اور اس کے خلاف قول کیا اب اس کو درست کرنے کے لیے کئی ناجائز کرنے پڑیں گے۔